ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ ❁
ڈاکٹر سہیل محمود ❁❁

علم الترجمہ میں نظریہ سازی کا تاریخی جائزہ

Historical review of theorization in translation studies

By *Dr. Yasmeen Sultana, Assistant Professor, Department of Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science & Technology.*
Dr. Sohail Mehmood, Assistant Professor, Department of Media Studies, Jinnah University for Women, Karachi.

ABSTRACT

It has only been few decades when translation study is acknowledged as a separate discipline of study and body of knowledge. In many countries including Pakistan there used to be no department of translation studies in universities. In west translation was initially considered a sub discipline of linguistics but after James S. Holmes wrote a paper "The name and nature of translation studies" it decisively became a separate discipline of study. Before the essay of Holmes translation was never considered a separate field of study but it also doesn't mean that there was no theorization about translation altogether. Historically speaking this theorization was mainly in the margins of great work of translations. This theorization is more like empirical nature because it is about the problems a particular translator faced about the translation of certain text from certain text language to certain target language. In this essay it is tired to compile and review of these theoretical approaches towards translations.

Keywords: Theorization, Gilgamesh, Sumerian Language, Cyrus the great, Letters of Aristeas.

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی، کراچی
❁❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ابلاغِ عامہ، جناح یونی ورسٹی برائے خواتین، کراچی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تاریخی طور پر ترجمے کے ضمن میں نظریہ سازی کا یہ عمل خود ترجمے کی روایت سے منسلک تھا اور ترجمے کی روایت کے آغاز کا سرا محققین اور مؤرّخین کے ہاتھ نہیں آتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمے کا عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنی زبانوں کی تاریخ ہے اور معلوم تاریخ اس تنوع کا سبب بتاتی ہے نہ اس کی وضع۔ اس عرصے میں ایک زبان کے اندر کہی ہوئی داستانیں جو دوسری زبان کے سامعین کو سنائی گئیں، شاہوں کے درباروں میں دور دراز مما لک کے راجاؤں کے پیغامات بھی ترجمہ ہوئے۔ اجنبی دیسوں سے آنے والے سفیروں نے سفارتکاری بھی کی۔ اس کے علاوہ سیاحوں اور راہگیروں نے مقامی لوگوں سے اپنا مافی الضمیر بھی بیان کیا ہوگا جس کے لیے ترجمے کی سرگرمی کام آئی ہوگی۔ نطق پر مبنی ان تراجم کے لیے بھی کوئی اصول اور قاعدے مرتب کیے گئے ہوں گے لیکن اب یہ ہماری اجتماعی یاداشت سے محو ہو چکے ہیں۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ تحریری تراجم ہیں اور ان کے حاشیوں میں درج ترجمے کے عمل میں پیش آنے والی مشکلات اور نو واردوں کے لیے اچھے ترجمے کی تجاویز ہیں۔

سمیری تہذیب کی منظوم داستان ''گلگوجنہ'' وہ پہلا مواد ہے جو تحریری طور پر زبان متن (سمیری زبان) سے زبان آماج (قدیم بابلی اور ہخامنشی) میں منتقل کیا گیا۔ پھر سائرس اعظم نے اپنے احکامات، میڈیا، لیڈیا، بابلی اور ہخامنشی زبانوں میں کرائے اور انھیں مٹی کی تختیوں پر کندہ کرایا۔ آج ہم نہیں بتا سکتے کہ مترجمین نے جن خطوط پر اس اولین ادبی شاہکار کا ترجمہ کیا ہوگا وہ کیا رہے ہوں گے؟

تراجم کی تاریخ میں دوسرا بڑا سنگ میل اسکندریہ کی لائبریری کے لیے مصر کے یونانی فرعون ''پولٹیمی دوئم'' کے ایما پر عبرانی عہد نامہ قدیم کی یونانی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس مقصد کے لیے تقریباً ۷۰ مترجمین کو ایک ہی متن ترجمے کے لیے دے کر ایک دوسرے سے ان کا رابطہ ممنوع کیا گیا۔ ۷۲ دن تک مسلسل کام کے بعد جب یہ ترجمہ مرتب ہوا تو ایک روایت کے مطابق یہ ''بالکل ایک جیسا تھا''[۱] جسے یونانی میں ''سپتوا گنت'' (ستر لوگوں کا کام) کہا جاتا ہے۔ اس ترجمے کی غایت پر ایک تبصرہ ''خطوط اریسطاس''[۲] میں موجود ہے جو بادشاہ پولٹیمی کے ایک درباری اریسطاس[۳] نے اپنے بھائی کو لکھا تھا۔ وہ رقم طراز ہیں: ''(۱) ہمارے اس مشن کا مقصد خدا کے قوانین کا ترجمہ کرانا تھا۔ (۲) کیوں کہ یہودی اپنے علاقے میں اپنے رسم الخط میں تحریر کرتے ہیں، اسی طرح ان کی زبان بھی خاص انھی سے مخصوص ہے۔ عمومی طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ شامی زبان استعمال کرتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے؛ یہ ایک دوسرا لہجہ ہے۔ (۳) دیمتریس کا بیان: یہودیوں کے قوانین کی مخصوص کتابیں اور چند دیگر کتب درکار ہیں مگر چوں کہ وہ عبرانی حروف اور عبرانی زبان میں لکھی ہوئی ہیں ان کی تشریحیں دستیاب ہیں لیکن ماہرین سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق یہ قدرے غیر محتاط طریقے سے کی گئی ہیں اور اپنے حقیقی معنی کے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مطابق نہیں ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انھیں شاہی سرپرستی حاصل نہیں رہی جبکہ یہ امر اپنی جگہ ضروری ہے کہ یہ کتابیں اپنی درست ترین صورت میں آپ کی لائبریری میں موجود ہوں کیوں کہ یہ ابدی قوانین ہیں جو دانش سے معمور اور اسقام سے پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نثر اور نظم نگار اور ان کے ساتھ ساتھ متعدد مورخین ان مذکورہ بالا کتابوں کے تذکرے اور اپنی زندگیاں ان کتابوں کی تعلیمات کے مطابق گزارنے والوں کے تذکرے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ وجہ یہ رہی ہوگی کہ ان (کتابوں میں پیش کیے گئے) خیالات کا ایک خاص تقدس اور پاکیزگی ہے۔ اریسطاس کے مکتوب سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی غایت ترجمہ قوانین خداوندی کا ترجمہ ہے۔ متن پر الوہی چھاپ کے پیش نظر اس کا ایک خاص تقدس ہے، اور اس کے ترجمے کا عمل اسی وقت معتبر ہوسکتا ہے جب وہ کسی نگرانی میں ہوا ہو اور یہ کہ بنا نگرانی کے ہونے والی تشریحیں غیر محتاط ہوتی ہیں اور وہ اپنے حقیقی معنی سے دور چلی جاتی ہیں۔

رومی مترجم سیسرو (۶۳ ق،م) نے یونانی خطیبوں کی تقاریر رومن میں منتقل کرنے کے دوران ترجمے کے عمل میں لفظ بہ لفظ اور معنی بہ معنی کے موضوع پر بحث کی ہے۔ تراجم کے حوالے سے وہ لکھتا ہے کہ ''میں ایک وضاحت کار کے طور پر ترجمہ نہیں کرتا بلکہ ایک مقرر[۴] کے طور پر ترجمہ کرتا ہوں۔ خیال اور ہیئت؛ جسے آپ صورت خیال کہہ سکتے ہیں کو برقرار رکھتا ہوں مگر ایسی زبان میں جو ہمارے استعمال اور امر کے مطابق ہے۔ میں ہر لفظ کے مقابلے پر لفظ لانے کو ضروری خیال نہیں کرتا لیکن میں عمومی اسلوب اور زبان کے زور کا اظہار کرتا ہوں۔''[۵] اس لحاظ سے غالباً وہ ترجمے کا پہلا نظریہ ساز ہے۔

تقریباً تین صدیوں کے وقفے سے اگلا بڑا حوالہ سینٹ جیروم (چوتھی صدی عیسوی) کا ہے۔ جیروم نے یونانی بائبل سپتواگنت کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس دوران ترجمے پر عمومی مباحث تحریر کیے جو بعد میں ہونے والے تراجم پر بھی اثرانداز ہوتے رہے۔ سینٹ جیروم بھی لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے رویے کو مسترد کرتا ہے کیوں کہ متن کی ہیئت کے زیادہ قریب رہنے سے متن کا معنی مسخ ہوتا ہے اور لایعنی سا ترجمہ تخلیق ہوتا ہے۔[۶] اس تنقید کے بعد اپنی حکمت عملی تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اب میں نہ صرف یہ تسلیم کرتا ہوں بلکہ کھلے عام اعلان کرتا ہوں کہ ماسوائے مقدس صحائف کے معاملے میں کہ جہاں خود لفظوں کے دروبست میں بھی الوہیاتی اسرار پائے جاتے ہیں، میں نے یونانی سے ترجمہ کرتے ہوئے لفظی ترجمے کے بجائے محاورتاً ترجمہ کیا ہے۔[۷]

ہندوستان میں مذہبی علوم کے گرد سنسکرت کا لسانی حصار بہت طاقتور تھا چناں چہ مذہبی تعلیمات کو اس سے نکلنے کی اجازت ہی نہیں ملی، مگر سنسکرت ادب کی زبان بھی تھی اور اس سے داستانوں، کہانیوں اور کتھاؤں کی دیگر

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مقامی زبانوں بنگالی، پالی، گجراتی میں منتقلی کا عمل جاری رہا۔ چناں چہ ویدیں اور اپنشدیں تو مقامی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوئیں لیکن ذیلی مذہبی داستانیں رامائن اور مہابھارت وغیرہ مقامی زبانوں میں ترجمہ کر لی گئیں جو بعدازاں خود بالذات مذہبی حیثیت اختیار کر گئیں۔(۸)

پراچین بھارت میں ہونے والے یہ تراجم بہت زیادہ آزادی سے کیے گئے، ایک معروف بھارتی مترجم پی لال کے مطابق بھارت میں ہونے والے تراجم کو تخلیقی تراجم کہا جاسکتا ہے۔(۹) یہ وہ عمل ہے جس میں ترجمہ ایک لسانی نظام سے لگے بندھے انداز میں معنی کی دوسرے لسانی نظام میں منتقلی نہیں ہوتی بلکہ یہ دوسری زبان میں نئے سرے سے ایک نیا بیانیہ بن جاتا ہے۔ چناں چہ اس سے پتا چلتا ہے کہ مغرب اور قدیم ہندوستان میں ترجمے کے تصور میں ایک بنیادی اختلاف تھا اور اسی وجہ سے ہندوستان میں پنپنے والے تنقیدی نظریات مختلف طریقے سے مرتب ہوئے۔ قبل از اسلام ہندوستان میں تراجم کے حوالے سے ایک اور ہندوستانی اسکالر دیوی لکھتی ہے کہ ''ہندوستان میں جس حد تک ذ والسانی ادبی تخلیقات کو ایک معمول کے ادبی رویے کے طور پر قبول کیا گیا اور جس قدر طویل عرصے تک قبول کیا گیا اس سے ہندوستان میں ترجمے کے شعور کا احساس ہوتا ہے۔ مغرب کے برعکس جہاں ترجمہ بائبل کی روایت سے پیدا ہوا، جہاں خدا کے لفظ کو بعینہٖ معنی کے ساتھ منتقل کیا جانا ترجمے کا مطلوب وصف تھا، ہندوستان میں ترجمے کی روایت ادب سے اور ہندو صنمیات سے جنم لیتی ہے جو متن کی عصمت کے تصور سے ناآشنا ہے اس کے برعکس ادب سے حاصل ہونے والے 'حظ' کو اہمیت دیتی ہے۔ سنسکرتی نظریے کو بیان کرتے ہوئے ایک پراچین بھارتی مصنف بھارتا نے اپنی کتاب 'نتیاسوترا' میں 'راسا' یا 'رس' وہ حتمی جذباتی مسرت ہے جو کسی بھی فن سے حاصل ہوتی ہے۔ ٹی ایس آر شرما کے مطابق اگر مترجم ماخذ متن سے یہ مسرت کا احساس حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اس کے ترجمے میں بھی 'رس' آجائے گا۔ شرما کے خیال میں اگر مترجم متن کے رس یا اسکی پراسرار داخلی آواز کو اپنے قابو میں کرلے تو یہی متن کا مجموعی وجدان یا احساس عطا کرے گی۔

چین میں ترجمے کی سرگرمی کو ثقافتی نصب العین تصور کیا جاتا ہے اور سنسکرت، انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبان سے تاریخی طور پر بکثرت ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ کنفیوشس سے منسوب ایک مکالمے میں کہا گیا ہے کہ اسم کا معنوی ترجمہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے اوریجنل تلفظ کے ساتھ نئی زبان میں منتقل ہونا چاہیے جبکہ باقی متن اپنی معنویت کے ساتھ زبان آماج میں منتقل ہونا چاہیے۔(۱۰) تیسری صدی عیسوی کے ایک چینی مصنف ''ذ ہی قیان' اپنی کتاب کے ابتدائیے میں ایک بدھ سے بھکشو سے ہونے والا مکالمہ درج کرتے ہیں جس کے مطابق بھکشو سے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کہا گیا کہ وہ بدھا کی اس تقریر کا ترجمہ کرے جب اس نے ٹوٹی پھوٹی چینی میں ترجمہ کیا تو سب نے شکایت کی کہ یہ بالکل بے رنگ ہے اور اس میں وقار وشکوہ کی کمی ہے تو بھکشو نے جواب دیا کہ بدھا کی تقریریں آسانی سے سمجھے جانے والی ہونی چاہییں نہ کہ خوبصورت کیوں کہ خوبصورت لفظ سچے نہیں ہوتے۔(۱۱)

تیسری صدی کے ایک اور چینی نظریہ ساز مترجم 'داؤ آن' نے ترجمے کے عمل میں ہونے والے پانچ نقصانات کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں پہلا ترتیب الفاظ ہے۔مثال کے طور پر اردو میں پہلے فاعل پھر مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے اس طرح یہ (فامف فع) زبان ہے جبکہ چینی (فافع مف) زبان ہے جس میں پہلے فاعل پھر فعل اور آخر میں مفعول آتا ہے۔اس طرح جب بھی ترجمہ ہوگا تو ترتیب الفاظ کا نقصان ہوگا۔دوسرا نقصان یہ ہے کہ سادہ اسلوب کی عبارت میں ادبی صنعتوں کے استعمال سے سادگی ضائع ہوجاتی ہے۔تیسرا نقصان ماخذ متن میں موجود تکرار کا ہوتا ہے جسے مترجم ضائع کردیتا ہے عموماً یہ تکرار مباحث اور تعلیٰ و قصائد کے مضامین میں ہوتی ہے۔چوتھا نقصان آخری خلاصے کے حصے میں ہوتا ہے جسے مترجم مختصر کردیتا ہے اور پانچواں نقصان تعارفی حصے کے خلاصے کو ضائع کرنے سے ہوتا ہے۔داؤ آن خلاصے کے عمل میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ ''کسی بزرگ، پیغمبر کی باتوں کا ترجمہ کیسے کیا جائے؟ ایک مذہب (دھرم) کی باتیں کسی دوسری مذہبی برادی کے سامنے کیسے کی جائے یعنی بدھ مت کا متن مسلمانوں سے کس طرح ابلاغ کر پائے گا؟اس ماخذ متن کو کیسے ترجمہ کیا جائے جسے بزرگوں کے مریدوں نے کئی کئی نسلوں کی محنت سے مرتب کیا ہے؟

ایک اور اہم چینی نظریہ ساز 'ہوئی یوآن' (۳۳۴-۴۱۶) ہے جو ترجمے میں عبارت کے شکوہ اور سادگی دونوں انتہاؤں کو ملانے کا تجویز کنندہ ہے وہ کہا ہے کہ اگر ترجمے میں بہت زیادہ ادبی چاشنی ہوگی تو یہ متن کے معنی سے بہت دور نکل جائے گا اور اگر بالکل سادہ ترجمہ ہوگا تو خیالات الفاظ کے سر سے گزر جائیں گے چناں چہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ الفاظ معنی کو گزند نہ پہنچائیں اور اچھے مترجم کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ماخذ مواد کو محفوظ رکھے۔

یوآن زہانگ (۶۰۰-۶۶۴) پانچ ناقابل ترجمہ کا نظریہ دیتا ہے۔ اس کے مطابق یہ پانچ چیزیں کبھی معنوی لحاظ سے ترجمہ نہیں کرنی چاہئیں اور ان کا تلفظ ہی منتقل کیا جانا چاہئے۔ان میں پہلا ''اسرار'' ہے یہ وہ مذہبی متن ہے جو منتروں اور آیتوں کی صورت میں رسوم کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا تصور ''بھاگ'' کا ہے جو بھگوت گیتا سے لیا گیا ہے اور بھاگ یا بھاگا ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں درجنوں معنی ؛قسمت، آسانی، نشونما، احترام، عزت، وقار پوشیدہ ہیں۔ ایسے الفاظ ترجمہ نہیں ہوسکتے۔ وہ الفاظ جن کا کوئی تصور کسی تہذیب میں ممکن ہی نہیں، مثال کے طور پر جمبو کے درخت جو چین میں کبھی نہیں ہوتے۔ چوتھا ماضی سے انحراف ہے اگر ماضی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

میں کسی خاص لفظ کے ترجمے کے لیے کوئی لفظ وضع کیا گیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اسی پہلے سے وضع کردہ لفظ کو استعمال کیا جائے نہ کہ دوسرا لفظ نئے سرے سے وضع کیا جائے اور پانچویں چیز جس کا ترجمہ ممکن نہیں وہ قاری کو دانش اور عقلمندی کے بجائے راستبازی اور احترام سے متاثر کرنے کی کوشش ہے۔ یوآن زہانگ کے بہت سے نظریات سے اختلاف ممکن ہے مگر اس کی اساسی حیثیت ترجمے کے اولین نظریہ سازوں میں شامل ہونا ہے۔

عرب میں بعثت نبوی کے بعد دعوت وتبلیغ کی غرض سے ترجمے کی سرگرمی کو فروغ ملا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت کے ذمے لگایا کہ وہ غیر ملکی زبانیں سیکھ کر رومیوں، یہودیوں اور ایرانیوں سے ابلاغ کریں۔ زید بن ثابت اس دور کے اہم اور معروف ترین مترجم ہیں۔ عباسیوں نے دنیا بھر سے ذوالسانی مہارت کے حامل افراد کو جمع کر کے بغداد میں دارالحکمہ بنایا جہاں ہندی، فارسی اور یونانی سے تراجم ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ہندو پنڈتوں کو سنسکرت سے ہیئت اور ریاضی کے مضامین ترجمہ کرنے کے لیے بھرتی کیا گیا۔[۱۲] عباسیوں کے بعد یہ روایت سلجوقی اور عثمانی ترکوں نے بھی جاری رکھی۔ تاہم اس دوران نجانے کیوں مسلم مترجمین یا دانشوروں نے ترجمہ کے حوالے سے نظریہ سازی پر کوئی خاص کام نہیں کیا۔ ایک استثنیٰ البتہ ابی عثمان الجاہز (۷۷۶-۸۶۸) کو حاصل ہے جو لکھتا ہے کہ ''اپنی خاصیت کے لحاظ سے شاعری کو عربوں اور عربی میں بات کرنے والوں میں خصوصی استثنائی درجہ حاصل ہے... اور شاعری کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں اسے (کسی ایک زبان سے دوسری میں) منتقل نہیں کیا جا سکتا اور جب اس کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا ڈھانچہ ٹوٹ جاتا ہے، اوزان اور بحور خطا ہو جاتے ہیں، اس کی خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے اور اس کا مقام تحیر گر جاتا ہے۔''[۱۳] ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ ''مترجم کو زبان کے ڈھانچے کا، لوگوں کی عادات کا اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے طریقے کا پتا ہونا چاہیے۔''[۱۴]

ادھر ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد ترجمے کی سرگرمی اور زیادہ فعال ہوئی، تزک بابری جو چغتائی زبان میں لکھی گئی تھی اسے ہمایوں کے ایک وزیر نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر نے سنسکرت سے فارسی میں تراجم کرائے، اسی کے دور میں مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہوا۔ اس کے علم دوست پوتے داراشکوہ نے کئی اپنشدوں اور بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا وجہی نے ''سب رس'' ۱۶۳۸ میں محمد قلی قطب شاہ کی فرمائش پر فارسی سے ترجمہ کی۔ یہاں نظریہ سازی نہیں ملتی اور اگر کہیں کتابوں کے حاشیوں میں موجود ہے تو وہ سامنے نہیں آ پائی۔ یہ امر مستقبل کے محققین کے لیے دعوت تحقیق ہے۔

ادھر یورپ میں نشاۃ ثانیہ بہت حد تک عربی زبان سے ہونے والے تراجم کی مرہون منت تھی لہٰذا یہاں ترجمے کو قائم بالذات علم کی حیثیت ملی اور جلد ہی ترجمے سے متعلق دانشوارانہ اور فلسفیانہ مباحث فروغ پانے لگے۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مغرب میں سترہویں صدی میں ترجمے سے متعلق اہم نظریات سامنے آئے، ان میں سب سے نمایاں ڈرائیڈن (۱۶۳۱-۱۷۰۰ء) کے نظریات ہیں جس نے ترجمے کی اقسام کی تثلیث کا؛ میٹافریز، پیرافریز اور امیٹیشن (نقل) کا نظریہ پیش کیا۔ ڈرائیدن ان میں سے میٹافریز (لفظی ترجمہ) کوتو وہ فوراً مسترد کرتا ہے کیوں کہ اس میں روانی پائی جاتی ہے نہ اس کی قرأت آسان ہوتی ہے۔ وہ امیٹیشن (نقالی) کو بھی مسترد کرتا ہے کیوں کہ اس میں ماخذ متن مترجم کے اپنے ادبی عزائم کی زد پر آجاتا ہے۔ ان دونوں اقسام کے بجائے وہ پیرافریز (محاورتاً ترجمے کا حامی ہے جس میں معنی برقرار رکھنے کے لیے لچک موجود ہو۔[۱۵] ۱۷۹۱ میں الیگزینڈر فریزر ٹیٹلر نے اصول ترجمہ پر مضامین لکھے، ٹیٹلر کے مطابق ترجمے کو اوریجنل متن میں موجود تین چیزوں کو پیش کرنا چاہیے اور ان میں متن کا خیال یا تصور، متن کا اسلوب اور ماخذ متن کی روانی شامل ہیں۔[۱۶] انیسیویں صدی کے اوائل میں رومانوی تحریک نے قابلِ ترجمہ اور ناقابلِ ترجمہ کے معاملات کو مبحث بنایا۔ ۱۸۱۳ میں جرمن مترجم فریڈرک شیلمشار کا مضمون ''ترجمے کے مختلف طریقے'' سب سے قابلِ ذکر ہے۔ شیلمشار (Schleiermacher) نے لفظی ترجمے، لغوی، محاوراتی یا آزاد ترجمے کے معاملات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حقیقی سوال یہ ہے کہ ماخذ متن کے لکھاری اور متن آماج کے قاری کو ایک دوسرے کے روبرو کیسے لایا جائے؟ وہ اس کے دو طریقے بتاتے ہیں؛ ''یا تو مترجم مصنف کو ہر ممکن حد تک اکیلا چھوڑ دے اور قاری کو لکھاری کی جانب لے آئے یا پھر وہ قاری کو ہر ممکن حد تک اکیلا چھوڑ دے اور اور لکھاری کو دھکیل کر قاری کے قریب لائے۔ شیلمشار اس ضمن میں پہلی حکمت عملی کو ترجیح دیتا ہے۔

شیلمشار کی نظر میں مترجم کو قاری پر وہی تاثر چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ماخذ متن کے اولین قارئین پر رہا ہوگا۔ یہ مقصد البتہ ترجمے کو اس کے اصل سے ''الگ'' کرنے کے ذرائع استعمال کیے بغیر ''فطری'' ترجمے کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس سے صرف اسی امر کو یقینی بنایا جاسکتا ہے کہ زبان متن کا مواد کسی زبان میں ترجمہ ہوسکے تاثر کی منتقلی ممکن نہیں ہو پائے گی۔

انیسویں صدی کے آخر میں چینی مصنف اور مترجم 'یان فو' نے بالخصوص ٹیٹلر کے زیر اثر اپنی نظریہ سازی کی جس کے تحت ایک مترجم کو تین مسائل کا سامنا ہوتا ہے اسے ماخذ متن سے وفاداری نبھانا ہوتی ہے، اسے ماخذ متن کی طرح اظہار کرنا ہوتا ہے اور ماخذ متن کا وقار یا خوبصورتی درکار ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار اس نے اپنے ترجمے ''ارتقا اور اخلاقیات ۱۸۹۳'' کے دیباچے میں کیا ہے۔[۱۷]

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

حواشی

۱۔ نوح ہچم (Noah Hacham)، *The "Letter of Aristeas": A New Exodus Story?*، مشمولہ *Journal for the Study of Judaism in the Persian, Hellenistic and Roman Period*، برل، جلد ۳۶، شمارہ ۱، ۲۰۰۵ء، ص ۱۔۲۰، ملاحظہ کیجیے:
https://www.jstor.org/stable/24669546، استفادہ: ۱۶ ستمبر ۲۰۲۰ء

۲۔ ایضاً

۳۔ اس قضیے سے قطع نظر کہ اریسطاس واقعی کوئی کردار تھا یا سپتواگنت کو معتبر بنانے کے لیے یہودیوں نے جعلی خط بنایا، یہ طے ہے کہ اس خط میں ترجمے کی غایت اور عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۴۔ واضح رہے کہ سیسرو خود بھی اعلیٰ پائے کا مقرر تھا۔

۵۔ سسرو (Cicero, 46BC/ 1960 AD)، *Selected Works: Against Verres I, Twenty-three letters, The Second Philippic against Antony, On Duties III, On Old Age*، مرتبہ مائیکل گرانٹ (Michael Grant)، (پینگوئن بکس، ۱۹۶۰ء)، ص ۱۷۔۲۰

۶۔ سینٹ جیروم (St. Jerome 395 CE/ 1892)، *The Principal Works of St. Jerome*، ترجمہ ڈبلیو ایچ فلیمینٹل (W. H. Fremantle)، ۱۸۹۲ء، ص ۲۱۴، ملاحظہ کیجیے: https://www.documentacatholicaomnia.eu/03d/1819-1893,_NPNF2-06. Jerome (395 CE),_The_Principal_Works_of_St._Jerome,_EN.pdf، استفادہ: ۱۶ ستمبر ۲۰۲۰ء

۷۔ منڈوے (Munday, 2001)، *Introducing Translation Studies: Theories and Applications*، (اوکسون: روٹلیج)، ص ۲۰۔۲۲

۸۔ مِنی چندران (Mini Chandran)، *The Practice of Translation in India*، آن لائن اشاعت: مؤرّخہ یکم نومبر ۲۰۱۶ء، ملاحظہ کیجیے:
https://www.sahapedia.org/the-practice-of-translation-india، استفادہ: ۱۶ ستمبر ۲۰۲۰ء

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ڈبلیو ہان (W. Han, 206 BC)، *Chinese Translation Theory*، ملاحظہ کیجیے:
http://en.wikipedia.org/wiki/Chinese_translation_theory

۱۱۔ زی قیان (Zhi Qian)، Chinese translation theory، ملاحظہ کیجیے: http://en.wikipedia.org/wiki/Chinese_translation_theory

۱۲۔ خلیق انجم، ''فنِ ترجمہ نگاری'' (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۰

۱۳۔ اسلام عیسیٰ (Islam Issa)، *Milton in the Arab-Muslim World*، ٹیلر اینڈ فرانسس، مشمولہ A Review of the History of Translation Studies, Theory and Practice in Language Studies، علی رضا غنونی (Ali Reza Ghanooni)، جلد ۲، شمارہ ۱، ص ۷۷۔۸۵

۱۴۔ میتھیو (Mathieu)، *The History of Translation in the Arab World*، ملاحظہ کیجیے:
http://culturesconnection.com/history-translation-arab-world/

۱۵۔ اے ایف وینوتی (A. F. Venuti)، *The Translation Studies Reader*، مشمولہ Translation Journal، (لندن: روٹلیج: ۲۰۰۴ء)، شمارہ ۱، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷

۱۶۔ علی رضا غنونی (Ali Reza Ghanooni)، *A Review of the History of Translation Studies* مشمولہ *Theory and Practice in Language Studies*، جنوری ۲۰۱۲ء، جلد ۲، شمارہ ۱، ص ۷۷۔۸۵

۱۷۔ یان فُو (Yan Fu)، *Evolution and Ethics*، (یونائیٹڈ پریس، ۱۸۹۷ء)، ص ۳۔۷، مشمولہ (Martynov, D.E & Martynova, J. A., (2016، Yan Fu and T. Huxley: How "Evolution and Ethics" turn into "Theory of Natural Development". Voprosy Filosofii، ص ۱۷۲۔۱۸۵

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مآخذ

۱۔ انجم، خلیق، ''فنِ ترجمہ نگاری''، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء

۲۔ سسرو (Cicero, 46BC/ 1960 AD)، *Selected Works: Against Verres I, Twenty-three letters, The Second Philippic against Antony, On Duties III, On Old Age*، مرتبہ مائیکل گرانٹ (Michael Grant)، پینگوئن بکس، ۱۹۶۰ء

۳۔ فُون، یان (Yan Fu)، *Evolution and Ethics*، (یونائیٹڈ پریس، ۱۸۹۷ء)، ص ۳۔۷، مشمولہ Martynov, D.E & Martynova, J. A., Yan Fu and T. Huxley: How "Evolution and Ethics" turn into "Theory of Natural Development". Voprosy Filosofii. (2016)،

۴۔ منڈوے (Munday, 2001)، *Introducing Translation Studies: Theories and Applications*، اوکسون: روٹلیج

ویب سائٹس

1. http://en.wikipedia.org/wiki/Chinese_translation_theory
2. http://culturesconnection.com/history-translation-arab-world/
3. https://www.sahapedia.org/the-practice-of-translation-india
4. https://www.documentacatholicaomnia.eu/03d/1819-1893,_Schaff._Philip,_3_Vol_06_Jerome,_EN.pdf
5. https://www.jstor.org/stable/24669546

جرائد

۱۔ تھیوری اینڈ پریکٹس اِن لینگویج اسٹڈیز، جنوری، ۲۰۱۲ء، جلد ۲، شمارہ ۱

۲۔ ٹرانسلیشن جرنل، روٹلیج، لندن، شمارہ ۱، ۲۰۰۴ء